ڈاکٹر عبدالغنی

اسلامی تحریک پر تصوّف کا اثر

جناب محمد مظہر الدین صدیقی نے عنوانِ بالا پر اکتوبر ۱۹۶۰ء کے مجلۂ ثقافت میں ایک مقالہ قلمبند فرمایا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ اسلامی تحریک پر تصوّف کا اتنا عظیم اثر ہے کہ کوئی صاحبِ فکر اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ تصوّف کا تعلق نہ صرف ہمارے دین سے بڑا گہرا ہے بلکہ ہمارا معاشرہ اور ہمارا ادب بھی اس سے متاثر ہوا۔ اور اس کے اثرات اس قدر دور رس ہیں کہ ممکن نہیں ہمارا حال اور ہمارا مستقبل ان سے پہلو تہی کر سکے۔ ہر اسلامی ملک میں عوام کیا اور خواص کیا بھاری تعداد میں اب بھی تصوف کو ایک زندہ حقیقت سمجھتے ہیں۔ اور اس سے وابستگی اپنے لیے دُنیوی اور اخروی سعادات کا موجب قرار دیتے ہیں۔ اندریں حالات فاضل مقالہ نگار کے قائم کردہ عنوان پر جس قدر توجہ صرف کی جائے کم ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے اس عنوان کے متعدد پہلو ہیں مگر صدیقی صاحب نے اس پر معاشرتی سود و بہبود کے نقطۂ نگاہ سے غور کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلامی تصوف نے خدمتِ خلق سے کامل بے اعتنائی برتی اور ہمارے معاشرہ میں مبالغہ آمیز انفرادیت کو ترقی دینے میں اس کا بڑا دخل ہے۔ لاریب مبالغہ آمیز انفرادیت ہمارے معاشرہ کا انتہائی اندوہناک مرض ہے اور جب تک اس کا قلع قمع نہیں ہوتا ہم ایک روشن مستقبل کی امید دل میں پیدا نہیں کر سکتے۔ ساتھ ہی صدیقی صاحب کا یہ خیال بھی بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد توڑنے میں ملوکیت نے افسوسناک کردار ادا کیا اور مسلمانوں کی موجودہ انفرادیت پسندی، گروہ بندی اور نسلی تفرقوں کی تخلیق میں ملوکیت نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ مگر ان کا یہ خیال کہ اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں تصوّفِ عالیہ کا بھی دخل ہے قطعاً درست نہیں۔

اسلامی تاریخ کے تمام ادوار کو سامنے رکھا جائے تو ہمیں ملوکیت صرف اپنے استحکام میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں کی تمام سیاسی کشمکش، گروہ بندی، معرکہ آرائی

اور داد و دہش کا صرف ایک مقصد نظر آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ برسرِ اقتدار رہیں۔ ملّی اور جماعتی مقاصد کی تکمیل کے لیے اگر کہیں بھی کوشش کی گئی ہے تو اس کی حیثیت محض ضمنی اور نمائشی تھی۔ خلفائے راشدین کو چھوڑ کر بنو امیہ، بنو عباس، بنو فاطمہ، تاتاری، مغل وغیرہ تمام ملوک کو صرف اپنی انفرادی اغراض سے سروکار تھا۔ اندریں حالات اگر انفرادیت کو فروغ حاصل نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ اِکّے دُکّے صالح فطرت بادشاہوں کا نمودار ہونا صرف اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ طبقۂ ملوک نے ملّی اور جماعتی مصالح کو ہمیشہ پسِ پشت ڈالا۔ اسی انفرادیت کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں مغل بادشاہوں کے کمزور ہونے پر وہ امراء باہم دست و گریباں ہو گئے جنہیں اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے مغل بادشاہ استعمال کرتے رہتے تھے۔ غیر ملکی حکومت نے اپنے استحکام کے لیے پھر خاص خاص افراد کو آلۂ کار بنایا۔ غیر ملکی اقوام کا اثر باقی اسلامی ممالک میں بھی پھیلا۔ ہر جگہ ان کی حکمتِ عملی یہی تھی۔ اس لیے اسلامی اور غیر اسلامی ملوکیت اور استعمار نے ہمارے ہاں یکے بعد دیگرے دلوں میں صرف انفرادی مفاد کی لگن پیدا کی اور جب پاکستان کی تخلیق عمل میں آئی تو وہی طبقہ برسرِ اقتدار آیا جسے کلیتہً اپنے ذاتی مفاد سے غرض تھی۔ ان تاریخی عوامل کے ہوتے ہوئے جماعتی بہبود کا احساس کس طرح پنپ سکتا تھا۔

مسلمانوں میں انتہا درجہ کی موجودہ مریضانہ خودغرضی کے پیدا کرنے میں مغربی تہذیب کا بھی بڑا دخل ہے۔ مغربی تہذیب نے سرمایہ دارانہ صنعتی انقلاب کی کوکھ سے جنم لیا۔ اس لیے خود اس کی فطرت میں انفرادیت پسندی ہے۔ اسی بنا پر اس تہذیب اور اس انقلاب کے اثرات اسلامی ممالک میں پھیلے تو انہوں نے بھی انفرادیت کی آگ کو مشتعل کیا۔ پھر مغربی تہذیب کا منتہائے مقصود حصولِ لذت ہے۔ احساس کی لذت کوشی کے علاوہ اس تہذیب کی تمام جدوجہد میں اور دھرا ہی کیا ہے۔ جُوں جُوں صنعتی انقلاب اور سائنسی ایجادات کی وجہ سے مغربی انسان تسخیرِ فطرت میں زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوتا چلا گیا توں توں اس کی لذت کوشی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اب احساسِ لذت خالصتہً انفرادی چیز ہے۔ مشرق جو پہلے ہی مختلف تاریخی عوامل کی وجہ سے انفرادیت پسند بن چکا تھا مغربی تہذیب کی ترویج اور اشاعت سے اس مرض کا اور بھی زیادہ شکار ہو گیا۔ اس لیے ملتِ اسلامیہ میں حد درجہ کی انفرادیت پسندی کا جائزہ لیتے ہوئے تمام داخلی اور خارجی اسباب اور وجوہات کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے جس بنا پر اسلامی ممالک کے اس مہلک مرض کے پیدا کرنے میں تصوف کو بھی دخیل سمجھا ہے وہ ارباب تصوف کی نجات کوشی اور تزکیۂ نفس ہے۔ ہمارے فاضل دوست کے خیال کے مطابق صوفی بزرگ اپنی اس لگن کی وجہ سے مسلمانوں کی عام معاشرتی زندگی سے بالکل کٹ گئے۔ انہیں حیات اور مسائل حیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر خود غرضانہ روحانیت نے مبالغہ آمیز انفرادیت کو ہوا دی۔ اس مرض کے شدید ترین احساس میں ڈوب جانے کی وجہ سے ہمارے مقالہ نگار کے قلم سے نئی نئی تراکیب از خود نکل رہی ہیں۔ لیکن جہاں تک اس مرض کا کسی حد تک تصوف کو ذمہ دار ٹھہرانے کا سوال ہے یقیناً یہ کہنا قابل معافی ہوگا کہ اس معاملہ میں محض ظن و تخمین سے کام لیا گیا ہے۔ صوفیائے کرام کے مستند تذکرے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی ورق گردانی سے اسلامی معاشرہ کے ساتھ ان بزرگوں کے تعلق کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں تصوف میں نجات کوشی اور تزکیۂ نفس کا جو مفہوم ہے اس کی صحیح نوعیت سے آگاہ ہونے کے لیے فاضل مقالہ نگار کو ابھی مزید معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز صوفیائے کرام کی ذہنیت کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے جو مثال دی ہے اس سے اخذ کردہ نتائج بھی گہرے غور و فکر کا ثبوت بہم نہیں پہنچاتے۔

رضائے الٰہی کے حصول کے لیے عبادات اور ریاضات میں غیر معتدل انہماک کی مثال دیتے ہوئے شیخ ابو الحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ سلطان محمود غزنوی جب شیخ موصوف سے ملاقات کے لیے خرقان پہنچا تو اس نے ایک قاصد شیخ کی خدمت میں اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ باریابی کی اجازت لائے اور قاصد کو ہدایت کی کہ اگر شیخ ملنے پر راضی نہ ہوں تو یہ آیت تلاوت کرنا۔ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولوالامر منکم۔ چنانچہ قاصد نے ایسا ہی کیا۔ شیخ نے فرمایا: من در اطیعوا اللہ چناں مشغولم و (مستغرقم۔ تذکرۃ الاولیاء) کہ در اطیعوا الرسول خجالتہا دارم تا بہ اولی الامر چہ رسد۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ شیخ خرقانی کو خدا کی اطاعت میں انسانوں کی برائی اچھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ معاشرہ اور خدمت خلق تو کجا انہیں رسولؐ کی اطاعت کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ مقالہ نگار اسے ویدانت اور بدھ مت کا اثر بتاتے ہیں۔ اب تھوڑی سی دیر کے لیے اس تمام واقعہ پر غور کر لینا ضروری ہے۔

شیخ فریدالدین عطار قدس سرہٗ نے یہ تمام واقعہ تذکرۃ الاولیاء میں درج کیا ہے۔ انہوں نے شیخ ابوالحسن خرقانی کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ تو کہا ہے کہ درحضرت عزت آشنائی عظیم داشت و درگستاخی کردن با حضرت خداوند تعالیٰ چناں بود کہ صفت نتواں کرد لیکن تینتیس صفحے کے اس طویل بیان میں کہیں بھی ایک لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات کہی ہو جس میں رسول اکرمؐ کی ذات سے سوء ادبی یا بے تعلقی کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ اس کے برخلاف شیخ ممدوح الصدر کے اتباعِ رسولؐ کے متعدد شواہد ملتے ہیں۔ نماز باجماعت کا وہ خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ کئی سال تک تو اس طرح ہوتا رہا کہ نماز باجماعت میں جس وضو سے عشاء کے وقت شامل ہوئے تھے اسی سے صبح کے وقت بھی شامل ہوئے۔ اس طویل بیان میں حضورؐ سرورِ کائنات کا بارہا ذکر آیا ہے اور ہر بار شیخ موصوف کی حضورؐ سے بے پناہ محبت اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک موقع پر شیخ صاحب نے فرمایا:

"علماء گویند ما وارثانِ رسولیم اما وارث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ما ایم کہ آنچہ او را بود بعضی ما داریم۔ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم فقیر بود و فقر بر خود اختیار کرد و ما خود اختیار کردیم بر خود۔ و با سخاوت بود و با خلق نیکو بود و بے خیانت بود و با دیدار بود و رہنمائے خلق بود و بے طمع بود۔ خیر و شر از حق تعالیٰ می دید۔ با خلائق او را عیشے نبود۔ اسیرِ وقتِ خود نبود۔ و ہر چہ خلق از و بترسیدند او نترسید و ہر چہ خلق بداں امید دارند او نداشت۔ و ہیچ چیز غرّہ نبود۔ ایں ہمہ صفتِ جواں مرداں است۔"

ایک اور موقع پر حضور سید الانبیاءؐ کی ثنا بیان کرتے ہوئے شیخ نے فرمایا:

"مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم دریائے بود بے نہایت کہ اگر قطرہ ازاں دریا بیروں آمدے ہمہ عالم و عالمیاں غرق شدندے۔"

دیکھیں ان واقعات اور اقتباسات کا ہمارے مقالہ نگار کے اخذ کردہ نتائج سے کتنا زبردست تضاد ہے۔ علاوہ بریں محمود کے قاصد کے جواب میں شیخ خرقانی نے جو لفظ خجالتاً استعمال کیا ہے اہلِ دل جانتے ہیں کہ اس میں وہ تمام بے شمار حسرتیں گویا ہیں جو اتباعِ رسولؐ میں شب و روز انہماک کے باوجود شیخ کے دل میں پھر بھی بے تاب تھیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات

بتاتے ہیں کہ شیخ صاحب کے عقیدہ اور مکاشفہ کے مطابق جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اس طرح بے نظیر تھی اور حضورؐ کا اسوۂ حسنہ اتنا ارفع اور اعلیٰ تھا کہ پوری پوری کوشش کے باوجود اس معیار پر پورا اترنا ناممکن تھا۔ اطیعوا اللہ کے تقاضے نے اتباعِ رسولؐ لازمی قرار دیا تھا (قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ) اور اس سلسلہ میں اپنی مسلسل مخلصانہ مساعی کے باوجود شیخ موصوف کو ندامت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ جو شخص بھی شیخ ابوالحسن خرقانی کی شخصیت کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرے گا وہ ان کے متنازعہ فیہ جواب کی اس تشریح سے پوری طرح متفق ہو گا۔

شیخ خرقانی قدس سرہ العزیز کے اس جواب سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے محمود کی طرف سے بے اعتنائی برتی تھی۔ اور اس برتاؤ میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔ محمود شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ شیخ کی ملاقات کے لیے خرقان آیا تھا۔ باہر خیمہ زن ہو گیا اور کہلا بھیجا کہ میں غزنی سے چل کر یہاں آیا ہوں۔ آپ اپنی قیام گاہ چھوڑ کر میرے خیمہ میں آجائیں۔ ملاقات کی خواہش کے باوجود محمود کے دل میں شاہانہ استکبار موجود تھا۔ شیخ اسی کو توڑنا چاہتے تھے۔ شیخ کا جواب سنا تو محمود پر رقت طاری ہو گئی اور کہا شیخ ان لوگوں میں سے نہیں جو ہمارا گمان تھا۔ حاضری کے لیے آمادہ ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ملوکانہ شعبدہ بازی سے کام لیا۔ ایاز کو اپنا شاہی لباس پہنایا۔ ایاز کا لباس خود پہنا۔ دس کنیزوں کو مردانہ لباس پہنایا۔ اور اس ہیئت کذائی کے ساتھ یہ قافلہ شیخ کی عبادت گاہ میں پہنچا۔ وہاں جا کر سلام کیا۔ شیخ نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے جواب دیا اور محمود کی طرف رخ کر کے فرمایا۔ آپ نے یہ دام بچھایا ہے۔ محمود نے عرض کیا ہاں۔ مگر آپ اس میں پھنسے نہیں۔ شیخ نے محمود کا ہاتھ پکڑا اور آگے بٹھا لیا۔ محمود نے عرض کیا۔ کچھ ارشاد فرمائیں۔ شیخ فرمانے لگے۔ پہلے ان نامحرموں کو باہر بھیج دو۔ کنیزوں کے چلے جانے پر محمود نے التماس کی۔ ازراہِ کرم حضرت بایزید بسطامی کے متعلق کچھ ارشاد فرمایا جائے۔ شیخ نے فرمایا۔ حضرت بایزید کا ارشاد ہے کہ جس نے مجھے دیکھا شقاوت سے محفوظ ہو گیا۔ محمود نے کہا۔ ابوجہل، ابولہب اور دیگر کفار قریش نے حضور سرورِ کونینؐ کو دیکھا تو شقاوت سے محفوظ نہ ہوئے۔ کیا بایزید کا مقام نبی اکرمؐ سے برتر تھا؟ شیخ نے محمود کو جھڑک کر فرمایا۔ ادب ملحوظ رکھیں۔ آپ کو اپنے کام سے سروکار رکھنا چاہیے۔ مصطفےٰ

صلی اللہ علیہ وسلم کی دید سے صرف ان کے چار یار اور صحابۂ کرامؓ مشرف ہوئے تھے اور اس کی دلیل یہ آیۂ کریمہ ہے۔ تریٰھم ینظرون الیک وھم لایبصرون۔ محمود کو یہ جواب بڑا ناپسند آیا۔ اس طرح باتیں ہوتی رہیں۔ محمود نے اشرفیوں کی تھیلی پیش کی۔ شیخ نے کھانے کو نانِ جویں عنایت فرمائی۔ لقمہ گلے میں اٹک گیا۔ بھلا بادشاہ کے حلقِ نفیس سے نانِ جویں کیسے نیچے اترتی۔ شیخ نے فرمایا۔ جس طرح درویشوں کا یہ لقمہ تیرے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ یہ تھیلی ہمارے لیے گلوگیر ثابت ہوگی۔ ہم تو اسے طلاق دے چکے۔ اٹھا لیجیے۔

الوداع کہنے کا وقت آیا تو شیخ اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمود نے کہا۔ حاضر ہوا تھا، تو آپ نے التفات نہ کیا۔ اب آپ کھڑے ہو رہے ہیں۔ یہ کس شے کی کرامت ہے۔ اب شیخ نے جو جواب دیا وہ حاصلِ کلام ہے۔ صوفیائے کرام کی مبارک ذہنیت کا صحیح معنوں میں آئینہ دار ہے۔ اور تصوف کی روح اس میں پوری طرح کارفرما ہے۔ ارباب فکر کو چاہیے اس جواب پر بار بار غور کریں۔ شیخ موصوف نے فرمایا:

"اوّل در رعونتِ پادشاہی و امتحان در آمدی و در آخر در انکسار و درویشی مے روی کہ آفتابِ دولتِ درویشی بر تو تافتہ است۔ اوّل برائے پادشاہی تو برنخاستم اکنوں برائے درویشی تو برخیزم۔"

صوفیائے کرام نے ہمیشہ موقع ملنے پر اسی طرح امراء و سلاطین کے احساسِ استکبار کی اصلاح کی۔ انہوں نے معمولی فوائد اور منافع پر لات ماری تھی تو عظیم ترین مقاصد کے لیے۔

جہاں تک شیخ کا معاشرہ سے بے اعتنائی اختیار کرنے کا سوال ہے اس کی بے حقیقتی بھی اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے سیرۃ النبی کے متعلق دیا ہے۔ اس کا از سرِ نو مطالعہ کریں۔ اس میں سخاوت، خلقِ نیکو، بے خیانت اور بے طمع کے الفاظ موجود ہیں اور ان تمام صفات کا تعلق معاشرہ کی سود و بہبود سے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اتباعِ رسولؐ کے سلسلہ میں شیخ نے ان صفاتِ حسنہ سے اغماض برتا ہوگا۔ محولہ بالا ملاقات کے وقت جب محمود نے نصیحت کے لیے عرض کی تو شیخ نے فرمایا:

"چہار چیز نگاہ دار۔ پرہیز از مناہی و نماز باجماعت و سخاوت و شفقت بر خلقِ خدا تعالیٰ۔"

اس نصیحت میں بھی معاشرہ کی بہتری اور بہبود کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ نیز ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ ابوالحسن خرقانی صرف قرآنی تعلیمات کو واجب العمل سمجھتے تھے۔ انہوں نے ویدانت اور بدھ مت کی تعلیمات کو ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا تھا۔ تذکرۃ الاولیاء سے ان کا صرف قرآن اور حدیث سے شغف ثابت ہوتا ہے۔ اور غالباً تذکرۃ الاولیاء ہی وہ اوّلین کتاب ہے جس میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ اس لیے یہ کہتے ہوئے ہمیں کوئی باک نہیں کہ ہمارے محترم مقالہ نگار کے اخذ کردہ نتائج واقعات اور حقائق کی روشنی میں صحیح ثابت نہیں ہوتے۔

شیخ ابوالحسن خرقانی کے متعلق سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے زیر نظر ہم اس اساسی اعتراض کی بابت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو جناب مظہر الدین صدیقی نے ارباب تصوف پر کیا ہے۔ ان بزرگوں کی نجات اس بات سے وابستہ تھی اور ان کا تزکیۂ نفس اس بات پر منحصر تھا کہ وہ دل و جان سے اتباعِ رسولؐ کریں۔ اسی اتباع کو سامنے رکھ کر وہ خدمتِ خلق کریں۔ مخلوقِ خدا کے ساتھ قولی اور عملی اظہارِ شفقت کریں۔ ہمدردی، احسان اور مروّت ان کا شعار ہو۔ لوگوں سے کسی چیز کا طمع نہ رکھیں۔ اپنے پاس جو کچھ ہو ان کے لیے حاضر کر دیں۔ بے نفسی اور بے غرضی کا پیکر بن جائیں۔ اور بالخصوص بے کسوں کے لیے مجسم رحمت ہوں۔ بگڑے ہوؤں کے اخلاق سدھاریں اور اپنے سوزِ نفس سے ان کے دل میں محبتِ الٰہی کا چراغ روشن کریں۔ ہر معاملہ میں اتباعِ رسولؐ کا پاس رکھیں اور اپنے بے غرض اور مخلصانہ عمل سے دوسروں کو اتباعِ رسولؐ کی مؤثر ترغیب دیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اپنے قلب کو ہر اس صفت سے پاک کیا جو مذموم ہے۔ اور ہر اس صفت سے مالا مال کیا جو محمود اور مستحسن ہے۔ بڑی محنت اور خوبی کے ساتھ انہوں نے صفاتِ الٰہی کو اپنایا۔ وہ مخلوق میں بھی شامل ہوتے تھے اور اللہ سے بھی واصل ہوا کرتے تھے۔ مخلوق سے دور رہ کر اسلامی تصوّف میں نجات اور تزکیۂ نفس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

صوفیائے کرام کے کارنامے سبحان اللہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے سینوں کو گرمایا۔ ملتِ اسلامیہ کے دلوں میں روحِ قرآنی کو زندہ اور تابندہ رکھا۔ اور اسلامی تحریک کو اقصائے عالم میں پہنچایا۔ وہ انفرادیت پسند نہیں تھے۔ اجتماعیت پسند تھے۔ معاشرہ کی نجات اور فلاح و بہبود کی خاطر انہوں نے بڑے سے بڑے جابر بادشاہوں کی مخالفت کی اور

ذرہ بھر خوف محسوس نہ کیا۔ امراء اور ملوک نے مال و دولت، جاہ و حشمت اور عیش و عشرت کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔ لیکن صوفیاء نے کمال درجہ کے ایثار سے کام لے کر صرف اقدارِ عالیہ کی شمع روشن کی!!! ——— بنابریں مبالغہ آمیز انعزاویت کا مرض جو اس وقت ملت میں موجود ہے اس کی ذمہ داری اربابِ تصوف پر عاید نہیں ہوتی وہ تو اس کے معالج رہے ہیں۔ اس کی ذمہ داری ان عوامل پر عاید ہوتی ہے جن کا شمار اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوفِ اسلامی نے اعلیٰ درجہ کے انسان اتنی تعداد میں پیدا کیے ہیں کہ مغرب و مشرق کی کوئی تہذیب کیا پیدا کرے گی۔ یہ بزرگ برتر انسانیت کا پیکرِ مثالی تھے۔ جسے یہودیوں نے دیکھا تو نبیِ اکرمؐ کی مخالفت چھوڑ کر آنحضرتؐ کے غلام بن گئے۔ عیسائیوں نے دیکھا تو حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ آتش پرستوں کی نگاہ اس پر پڑ گئی تو توحید پرست بن گئے۔ بدھوں کے سامنے آیا تو رسولِ عربیؐ کی صداقت کے قائل ہو گئے اور ہندوؤں نے اس کا جلوہ دیکھا تو رام رام چھوڑ کر بے اختیار کلمۂ طیبہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اور جہاں تک خود مسلمانوں کا تعلق ہے، عوام کیا اور خواص کیا۔ رعایا کیا اور راعی کیا۔ علماء کیا اور حکماء کیا۔ انہوں نے تعلیماتِ دینی کے اس پیکرِ مثالی کی زیارت کی تو ان کا تزکیۂ نفس ہو گیا اور ان کا جذبۂ ایمان قوی سے قوی تر ہو گیا۔

یہاں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس کے ایک ایک لفظ کی تائید میں بیسیوں شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اسی برِ صغیر میں حضراتِ خواجہ اجمیری، خواجہ محبوب الٰہی اور مجدد الف ثانی نے مخلوقِ خدا کی بہبود کے لیے جو کچھ کیا وہ محیر العقول ہے۔ اس قسم کی مثالیں ہند اور بیرونِ ہند میں بڑی ملتی ہیں۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم مستشرقین کی عینک سے اسلامی تصوف کا جائزہ لینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جو لوگ خود اسلام، بانیٔ اسلام (روحی فداہٗ) اور قرآنِ مجید پر طعنہ زنی کرنے سے گریز نہیں کرتے اور ان کی تعلیمات کو یہودیت اور عیسائیت کی صدائے بازگشت کہتے ہیں۔ اُن کی زبان سے اسلامی تصوف سے متعلق کلمۂ خیر مشکل نکلے گا۔ وہ اسے بعجلت تمام نو فلاطونیت، عیسائی تصوف۔ بدھ مت اور ویدانت کا پروردہ یافتہ نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ یہاں مستشرقین پر اعتراض کرنا مقصود نہیں۔ مختلف اسباب کی بناء پر وہ معذور ہیں۔ مطلوب صرف یہ عرض کرنا تھا کہ ہمارا تصوف خود اسلام کی پیداوار ہے۔ اس کا مغز ہے۔ غارِ حرا کی آغوش میں اس کی تخمیر ہوئی۔ والذین اٰمنوا اشد حبا للّٰہ

کے فرمان نے اسے توانائی بخشی۔ اور لی مع اللہ وقتؒ کی بشارت نے اسے بال و پر عطا کیے صحابۂ کرامؓ خود بہت بڑے صوفی تھے۔ بعد میں ملوک کی خود غرضی نے جب بر سر اقتدار طبقہ کو روحِ اسلام سے بے گانہ کر دیا تو صوفیائے کرام بڑی بے نفسی سے اس کے پرستار بنے رہے۔

بنابریں میں اپنے فاضل معاصرین سے التماس کروں گا کہ وہ بڑی بلند نظری سے اپنے مختلف ملی شعبوں کا جائزہ لیں۔ مرورِ ایام سے ان میں رطب و یابس شامل ہو چکا ہو گا۔ لیکن صالح عناصر ان میں اس قدر موجود ہیں کہ بالغ نظری سے کام لے کر ان سے ایک درخشاں مستقبل کی داغ بیل رکھی جا سکتی ہے۔ زوال خوردہ اقوام احساسِ مغلوبیت کی بنا پر اپنے ہر ادارہ کی تنقیص کیا کرتی ہیں۔ اب وہ وقت نہیں۔ دنیا بھر کی تہذیبیں جدید تقاضوں کی وجہ سے ایک عظیم خلفشار میں مبتلا ہیں۔ اور ادھر ہم اس دوراہے پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے حیاتِ نو کی منزل شروع ہوتی ہے۔ ہمیں اب امام غزالی ایسی ہستیوں کی ضرورت ہے جو علومِ حاضرہ میں مہارتِ تامہ حاصل کر کے اپنی دینی اقدار کی فوقیت اور برتری ثابت کریں۔ حجۃ الاسلام کہلائیں اور جوہری توانائی کے دور میں نوعِ انسانی کو نہایت ہی صالح راہوں پر گامزن کریں۔ صالح ہیئتِ اجتماعی کی تعمیر کے لیے ایک عالی فطرت صوفی کی بے نفسی، بالغ نظری اور روحانی تڑپ ضروری ہے۔

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق

مصنفہ بشیر احمد ڈار

عہدِ قدیم میں چین، ایران، مصر اور یونان کی تہذیبوں نے حیرت انگیز ترقی کر لی تھی اور یہاں کے مفکروں نے جو افکار و نظریات پیش کیے انہی کی بنیاد پر جدید افکار کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں کون فیوشس، گوتم بدھ، زرتشت، مانی، سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم مفکروں کے اخلاقی نظریات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور